''سیٹو سنٹو معاہدوں سے کیری لوگر بل تک''
''تمہیں'' بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

پروفیسر خالد شبیر احمد

جو کچھ اس وقت ہمارے ملک میں ہو رہا ہے اور ہم بحیثیت ایک قوم جن خطرناک حالات میں گھرے ہوئے ہیں، اس سے ہر باشعور شہری انتہائی پریشان ہے۔ پورا ملک ایک ایسے سیاسی و معاشی بحران سے گزر رہا ہے جسے بیان کرنے کی نہ ہم میں کوئی سکت باقی رہ گئی ہے اور نہ ہی اس صورتحال کو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان حالات میں بھی ہماری قیادت جو کہ جمہوریت کے بطن سے پیدا ہو کر تختِ حکمرانی پر فائز ہے اُسی طرح حب الوطنی اور دینی غیرت کو خیر باد کہہ کر پاکستانی سیاست دانوں کی اُس روش کو برقرار رکھے گی جو قیامِ پاکستان سے انھوں نے اختیار کی ہوئی ہے تو نتائج سنگین صورتحال پیدا کر دیں گے۔ اگر موجودہ ملکی حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہمارے حکمران سیاست دانوں کا سب سے بڑا مسئلہ اقتدار پر قابض رہنا ہے۔ اسی کے لیے انھیں اُن دشمنوں کی طرف سے مدد درکار ہے جو دوست بن کر اس ملک کی بنیادوں کو متزلزل کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ ملک کی بدنصیبی ہے کہ خواہش اقتدار کو انھوں نے اقتدار کی کرسی پر خدا بنا کے بٹھا دیا ہے اور دن رات یہ لوگ اس کی پرستش میں مصروف ہیں۔ ان اقتدار والوں کے لیے کوئی اصول، کوئی ضابطہ، کوئی قاعدہ، کوئی قانون، کوئی مسلک، کوئی مؤقف کسی قسم کی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ امریکی مداخلت ہمارے ہاں اس قدر شدید نوعیت اختیار کر چکی ہے کہ اسے روکنا اب ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل بات ہے۔ اس امریکی مداخلت کو کیسے روکا جا سکتا ہے جو ہمارے ملک کے حکمرانوں نے بڑے اہتمام و احترام کے ساتھ اسے اپنے ذاتی مفادات کے لیے خود قبول کی۔ انھیں کے ذریعے امریکی مداخلت شروع ہوئی۔ معاہدہ، سیٹو اور سنٹو سے لے کر ''کیری لوگر بل'' تک جس نے ملک میں ایک کہرام مچا دیا ہے اور جس پر ہر ذی شعور پاکستانی صرف سراپا احتجاج ہی نہیں بلکہ انتہائی پریشان و فکرمند بھی ہے کہ اگر یہ بل امداد کی صورت میں پاکستان پر مسلط کر دیا گیا تو پھر امریکی مداخلت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر نہ صرف ہماری داخلی و خارجی حکمت عملیوں کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے گی بلکہ ہماری فوج کے نظم و نسق میں بھی کھلبلی مچا دے گی۔ ہمارے ایٹمی پروگرام اور اس کی ترقی رک کے رہ جائے گی اور ہمارے حکمران ہر چھے ماہ کے بعد امریکہ کے وزیر خارجہ کے سامنے اس طرح جواب دہ ہوں گے جس طرح نالائق شاگرد اپنے استاد کے سامنے اپنی نالائقی کی وجہ سے جواب دہ ہوتا ہے۔

ہمارے سیاست دان اگر واقعی سیاست دان ہوتے تو ملک کے یہ حالات نہ ہوتے۔ ان کی نااہلی کا ثبوت تو پاکستان کے ابتدائی چند برسوں میں ہی واضح ہوکر سامنے آ گیا تھا، جب پاکستان میں 1947ء سے لے کر 1958ء تک یعنی 9 برسوں میں ملک کے سات وزیراعظم یکے بعد دیگرے تبدیل ہوئے۔ ان میں ایک وزیراعظم صرف چالیس روز کے لیے تھا اور ایک وزیراعظم نے تو یہاں ارشاد فرما دیا تھا کہ اگر آپ نے کشمیر کا مسئلہ حل کرانا ہے تو کسی اور کو وزیراعظم بنالو، پنڈت میرا بڑا بھائی ہے اور میں اُس کا احترام کرنے پر مجبور ہوں۔

پھر جب بھی ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا، سیاست دانوں نے ہی اس کا استقبال کیا اور سیاست دان ہی مارشل لاء حکومت میں فائز ہوئے۔ اس سے بڑی اور کیا دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ ان سیاست دانوں کو صرف وزارتیں درکار ہوتی ہیں، خواہ وہ انھیں نام نہاد جمہوریت کے ذریعے حاصل ہوں یا پھر فوجی حکمرانوں کے ذریعے۔ کون سے فوجی آمر کے ساتھ یہ جمہوریت زدہ نہیں تھے۔ وہ جنرل ایوب ہو یا پھر جنرل ضیاء و یحییٰ یا پھر ان تینوں جرنیلوں کا پیرومرشد، قاتل جمہوریت، دشمنِ اسلام، حلیفِ امریکہ وحریفِ پاکستان جنرل پرویز ان سب کے ساتھ ہمارے سیاست دان ان کے ہر جرم میں شریک کار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان کا سیاست دان آمرانہ طرزِ عمل کا شکار ہو کے رہ گیا ہے۔ موجودہ حکمرانوں میں جنرل پرویز کی آمرانہ حکومت کا رنگ ڈھنگ اس قدر نمایاں ہے کہ اس حکومت کو ہم جنرل پرویز کی حکومت کا پرتَو یا پھر تسلسل کہنے پر مجبور ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جنرل صاحب امریکہ کی نوکری کرتے کرتے تھک گئے تھے تو امریکہ نے انھیں ہٹا کر تازہ دم جمہوری رہنماؤں کو اُن کی جگہ بٹھا دیا ہے اور حکم ہوا کہ وہی کام کرتا ہے جو جنرل پرویز کرتا رہا اور اُسی کام کو آپ نے مکمل کرنا ہے جسے وہ چھوڑ کے گیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے اور جس پر پوری قوم احتجاج کی آگ میں جل رہی ہے۔ یہ جنرل پرویز کی حکمتِ عملی کا تسلسل بھی ہے:

اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی
اُنہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

یہ خواہش اقتدار نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک آدمی ملک کی پوری سیاست پر حاوی ہے اور فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی طرح وہی ایک آدمی ہر حوالے اور ہر زاویے سے ملکی سیاست پر چھایا ہوا ہے اور پھر اس ایک آدمی کے ہاتھ میں ''اٹھاون ٹو بی'' کی تلوار بھی ہے جو اسے جنرل پرویز سے امریکہ کی وساطت سے ورثہ میں ملی ہے جس کے ذریعے وہ جب چاہے پوری اسمبلی کو قتل کرسکتا ہے۔ یہ ہے اس جمہوری راگ کا وہ الاپ جس پر انھیں ناز ہے اور یہ لوگ سر اونچا کر کے کہتے ہیں کہ ہم جمہوریت کے چمپئن ہیں۔ یہ کیسی جمہوریت ہے جو فردِ واحد کو پوری اسمبلی پر ایسی فوقیت دے دیتی ہے کہ پوری اسمبلی اُس کی محتاج وممنون بن کے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی کہہ رہی ہے کہ جو حکم حضور، ہر حکم کی تعمیل ہوگی:

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

اسی تلوار سے صدر اسحاق نے نواز شریف کی حکومت کو ختم کیا۔ اسی تلوار کا شکار بے نظیر بھٹو بھی ہوئی اور اب یہی تلوار اسمبلی کے سر پر ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس تلوار کا اب کوئی کام نہیں ہے کہ تلوار اُس کے ہاتھ میں ہے جو اس پارٹی کا سربراہ ہے جس کی اسمبلی میں اکثریت ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ تلوار توڑ کیوں نہیں دی جاتی؟ اس لیے توڑی نہیں گئی کہ تلوار استعمال بھی ہو، صرف سروں پر لٹکتی رہے تو پھر اس سے کئی مفادات حاصل کیے جاسکتے ہیں اور حد یہ ہے کہ ہمارے اندرونی معاملات کو بھی امریکہ کی آشیر باد حاصل ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ پاکستان کے اندرونی و بیرونی معاملات صحیح رخ اختیار کریں یا پھر ان حالات و معاملات میں استحکام پیدا ہو کہ اس طرح ہی پاکستان، امریکہ کے در پر بھکاری بن کر کھڑا رہ سکتا ہے جبکہ امریکہ کی یہ حکمتِ عملی دوستی نہیں دشمنی سے بھی دو چار قدم آگے ہیں:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

امریکہ بہادر نے شروع سے ہی ہمارے ساتھ ایک ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ اس رویے سے دوستی کی بو تک نہیں آتی۔ ہم نے ابتداء میں روس کی دعوت کو مسترد کرتے ہوئے امریکہ کی دوستی کی دعوت قبول کی۔ ہم نے امریکہ کو ہی خوش کرنے کے لیے ''سیٹو اور سنٹو'' کے فوجی معاہدوں پر دستخط کیے۔ ہم نے روس کے خلاف امریکہ کے فوجی اڈے کے طور پر اپنے آپ کو پیش کیا۔ ہم نے امریکہ کی دوستی کے لیے روس کی دشمنی مول لی، لیکن امریکہ نے ہمارے لیے کیا کیا۔ 1965ء کی جنگ میں امریکہ نے ہماری کیا مدد کی؟ صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ ہمارا آپ کا فوجی معاہدہ کمیونسٹ ممالک کے ساتھ جنگ کا تھا اور بھارت کوئی کمیونسٹ ملک نہیں۔ لہٰذا ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ پھر 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں امریکہ کا کردار ہمارے ساتھ انتہائی گھناؤنا اور وحشیانہ تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ ایک ایسا ڈرامہ تھا جس کا آغاز امریکہ کی مدد سے ہوا اور انجام روس کے تعاون کے ساتھ یعنی ہمارے دوست نے ہمارے دشمن (جو کہ اس کی دوستی کی وجہ سے بنا تھا) کے ساتھ مل کر ہمیں دولخت کیا۔ امریکہ کا بحری بیڑہ فقط افواہوں کی حد تک محدود رہا۔ نہ اسے مشرقی پاکستان کا ساحل نظر آتا تھا اور نہ آیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت کی بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی جنگ سے چند روز پہلے امریکہ یاترا پر گئی اور واپسی پر دہلی کے ائیر پورٹ پر اس نے ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا کہ ہم امریکہ کے پابند نہیں ہیں۔ جو ہماری مرضی ہوگی ہم وہی کریں گے۔ میں نے اُس وقت اپنے دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ امریکہ نے بھارت کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مشرقی پاکستان پر حملہ ہونا تھا سو ہو کر رہا۔ اس حملے کے لیے امریکہ کی بھارت کو آشیر باد حاصل تھی۔ سابق امریکی صدر نکسن نے اپنی کتاب میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ بھارت تو اُس وقت مغربی پاکستان پر بھی حملہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہم نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ اب جو طاقت بھارت کو مغربی پاکستان پر حملہ کرنے سے روک سکتی ہے وہی طاقت مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے کہہ بھی سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا اور بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا، جس سے کسی ذی شعور کو انکار کی مجال نہیں۔

یہ الطاف بھائی کا قادیانیوں کے حق میں بیان، سلمان تاثیر کا ناموسِ رسالت کے خلاف بیان یہ سب کچھ امریکہ بہادر کی پاکستان میں بالادستی کو ہر لحاظ سے برقرار رکھنے کے لیے فضا تیار کی جارہی ہے۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان کی حکومتوں کو تین ہدف دیئے گئے ہیں۔ پہلا ہدف تو جنرل پرویز کی حکومت میں حدود آرڈیننس کو ختم کر کے پورا کرلیا گیا، لیکن ابھی تک امریکہ کے دو ہدف باقی ہیں۔ ناموسِ رسالت آرڈیننس ختم کرانا امتناعِ قادیانیت آرڈیننس جس کے لیے الطاف بھائی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ آخر ایک مدت سے وہ جس ملک کے میں زندہ رہے ہیں اور اُس فضا نے بھی رنگ لانا تھا۔ مرزا قادیانی نے جس سلطنت کی حفاظت کے لیے اپنے تن من دھن کی بازی لگادی تھی۔ اب اُس سلطنت کی ترجمانی کا فریضہ جناب الطاف بھائی سرانجام دے رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ مرزا مسرور سے ملے ہیں۔ ابھی قادیانیت سے اُن کی ملاقات نہیں ہوئی۔ کاش کوئی ان کی قادیانیت سے ملاقات کرائے تو انھیں بھی سمجھ آجائے کہ قادیانیت کیا ہے؟ محض مرزا مسرور سے ملاقات کے ذریعے تو قادیانیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ علامہ اقبال جس کا نام انھوں نے اپنے انٹرویو میں تین دفعہ لیا اور تینوں بار انھوں نے رحمتہ اللہ علیہ کہہ کے نام لیا۔ اُن سے ہی الطاف بھائی پوچھ لیں کہ وہ قادیانیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے تو قادیانیوں کو اسلام اور ہندوستان دونوں کا غدار قرار دیا تھا۔ پھر علامہ اقبال، الطاف بھائی کے لیے رحمتہ اللہ علیہ کیسے ہوگئے۔ بس یہی کہنا پڑتا ہے کہ

ہے یہ وہ جامہ نہیں جس کا کوئی الٹا سیدھا

اصل مسئلہ امریکہ بہادر ہی ہے اور یہ سب کچھ جو ہمارے ملک میں ہورہا ہے۔ اُسی کے دم قدم سے ہے۔ جنرل حمید گل نے آج سے کافی عرصہ پہلے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ہم پاکستانیوں کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہم امریکہ سے نفرت کریں اور پاکستان کی سیاسی قیادت کو یہ فرض ادا کرنا چاہیے کہ وہ پاکستان میں امریکہ کے خلاف انتہائی نفرت پیدا کرنے کے لیے ایک مؤثر اور منظّم تحریک کا آغاز کرے۔ ویسی ہی تحریک جیسی کہ 1953ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے چلائی گئی تھی۔ ویسی ہی تحریک جو 1974ء میں قادیانیوں کے خلاف چلائی گئی اور ویسی ہی تحریک جو 1971ء میں پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے چلائی گئی یا پھر اُسی نوعیت کی تحریک جو پاک افغان کونسل کی قیادت میں امریکہ کے خلاف چلائی گئی۔ اسی میں ہی پاکستان اور پاکستانیوں کی عافیت کا راز مضمر ہے۔ ورنہ تو یہ ملک جو ہمارے اسلاف نے بے پناہ قربانیوں سے انگریزوں کی غلامی سے چھڑایا تھا۔ امریکہ کی غلامی میں جاتا نظر آتا ہے۔ کاش اُن جیسا کوئی ایک بھی ہوتا تو آج امریکہ اور امریکہ نواز پاکستانی قیادت کا راستہ روک کے رکھ دیتا:

کہاں گئے وہ جنوں آشنا وہ دیوانے
بڑے اُداس ہیں یارو خرد کے ویرانے